آغا ناصر

فیض کی شاعری میں موت اور تنہائی

Agha Nasir

Death and Loneliness in Poetry of Faiz

Faiz Ahmed Faiz was a multi dimensional poet.His work encircles various aspects of human nature. Death and aloneness are the most effective factorsin his poetry. Faiz wrote much on these themes In this article "Death and Loneliness " the writer emphasized these two significant reflections from his poetry

فیض صاحب کو موت سے ڈر لگتا تھا۔انہیں تنہائی سے خوف آتا تھا۔

موت اور تنہائی، یہ دو موضوعات ہیں جن پر فیض نے بہت سے شعر کہے۔ان اشعار کو پڑھ کر ہر دو موضوعات پر ان کا نظریہ ان کا رویہ بڑی حد تک واضح ہو جاتا ہے۔موت کے بارے میں تو انہوں نے ایک حوصلہ مند، نڈر اور بے باک انسان کی طرح اپنے اس ایک شعر میں وہ سب کچھ سمو دیا ہے جو وہ محسوس کرتے تھے۔

جینے کے فسانے رہنے دو　　اب ان میں لکھ کے کیا لیں گے
اک موت کا دھندہ باقی ہے　　جب چاہیں گے نمٹا لیں گے

اس شعر میں بڑے واضح طور پر انہوں نے ظاہر کر دیا ہے کہ ان کے نزدیک موت کی کوئی ایسی اہمیت نہیں ہے۔

''جب چاہیں گے نمٹا لیں گے''لیکن تنہائی کا معاملہ کچھ اور ہے۔

فیض صاحب طبعًا بہت رونقی آدمی تھے۔انہیں سناٹے، خاموشیاں اور سرگوشیاں پسند نہیں تھیں۔وہ شام کی محفلوں کے آدمی تھے۔ بحث مباحثہ، شور وغل، گپ شپ۔اگر چہ وہ خود خاموش طبع انسان تھے اور محفلوں میں کم کم ہی بولتے تھے مگر دوسروں کا بولنا انہیں اچھا لگتا تھا۔

کسی طرح تو جمے بزم میکدے والوں
نہیں ہے بادۂ ساغر تو بادِ جو ہی سہی

فیض صاحب کی طبیعت میں ہمیشہ سے تنہائی کا خوف موجود تھا۔لیکن اس کا باقاعدہ اظہار انہوں نے شاعری میں پہلی بار اس وقت کیا جب راولپنڈی سازش کیس میں انہیں گرفتار کیا گیا۔لاہور کے شاہی قلعہ میں ''قید تنہائی'' میں رکھا گیا۔

قید تنہائی

دور آفاق پہ لہرائی کوئی نور کی لہر
خواب ہی خواب میں بیدار ہوا درد کا شہر

خواب ہی خواب میں بیتاب نظر ہونے لگی
عدم آباد جدائی میں سحر ہونے لگی
کاسۂ دل میں بھری اپنی صراحی میں نے
گھول کر، تلخیٔ دیر و زمیں امروز کا زہر
حسرت روز ملاقات رقم کی میں نے
دیس پر دیس کے یاران قدح خوار کے نام
حسن آفاق، جمال لب و رخسار کے نام

لیکن تنہائی کے موضوع پر اپنی شاعری کا آغاز وہ اس سے بہت پہلے کر چکے تھے۔ان کی یہ شہرہ آفاق نظم ان کی پہلی کتاب ''نقش فریادی'' میں شامل ہے۔اس سے شاید کوئی انکار نہ کر سکے کہ اس نظم سے بہتر تنہائی کی تصویر اور تنہائی کا احساس ممکن نہیں ہے۔

پھر کوئی آیا دل زار! نہیں کوئی نہیں
راہرو ہوگا، کہیں اور چلا جائے گا
ڈھل چکی رات، بکھرنے لگا تاروں کا غبار
لڑکھڑانے لگے ایوانوں میں خوابیدہ چراغ
سوگئی راستہ تک تک کے ہر اک رہگزار
اجنبی خاک نے دھندلادیے قدموں کے سراغ
گل کرو شمعیں، بڑھا دو مے و مینا و ایاغ
اپنے بے خواب کواڑوں کو مقفل کرلو
اب یہاں کوئی نہیں، کوئی نہیں آئے گا

''یہ ہمارے طالب علمی کے دن تھے۔یوں تو سب اشعار کا تقریباً ایک ہی ذہنی اور جذباتی واردات سے تعلق ہے اور اس واردات کا ظاہری متحرک بھی وہی ایک حادثہ ہے جو اس عمر میں اکثر نوجوان دلوں پر گزرجات۔لیکن اب جو دیکھتا ہوں تو یہ دور بھی کوئی ایک دور نہیں تھا اس سے دو الگ الگ حصے تھے جن کی داخلی اور خارجی کیفیت کافی مختلف تھی۔وہ یوں کہ 1920 سے 1930 تک کا زمانہ ہمارے ہاں معاشی اور سماجی طور پر کچھ عجب طرح کی بےفکری، آسودگی اور ولولہ انگیزی کا زمانہ تھا۔لیکن ہم اس دور کی ایک جھلک بھی ٹھیک سے نہیں دیکھنے پائے تھے کہ صحبت یار آخر شد پھر دیس پر عالمی کساد بازی کے سائے ڈھلنے شروع ہوگئے۔کالج کے بڑے بڑے بانکے تمیں مار خاں تلاش معاش میں گلیوں کی خاک پھانکنے لگے۔یہ وہ وقت تھا جب اچانک بچوں کی ہنسی بجھ گئی، اجڑے ہوئے کسان کھیت کھلیان چھوڑ کر شہروں میں مزدوری

کرنے لگے اور اچھی خاصی شریف بہو بیٹیاں بازاروں میں آ بیٹھیں۔ گھر کے باہر یہ حال تھے اور گھر کے اندر مرگ سوگ محبت کا کہرام مچا تھا۔ یکا یک یوں محسوس ہونے لگا کہ دل و دماغ پر سب ہی راستے بند ہو گئے اور اب یہاں کوئی نہیں آئے گا۔''

اسی زمانے میں فیض صاحب نے ایک اور نظم لکھی جس کا عنوان تھا ''یاد'' مگر یہ بھی شروع سے آخر تک تنہائی کے کرب سے بھری ہوئی تھی۔ اس مترنم نظم میں فیض صاحب نے جیسی خوبصورت اور انوکھی تلمیحات استعمال کی ہیں ان ثانی خود فیض صاحب کی اپنی شاعری میں بھی نہیں ملتا۔ دشت تنہائی میں اے جان جہاں رقصاں ہیں۔

دشت تنہائی میں، اے جان جہاں ، لرزاں ہیں
تیری آواز کے سائے، ترے ہونٹوں کے سراب
دشت تنہائی میں، دوری کے خس وخاک تلے
کھل رہے ہیں، ترے پہلو کے سمن اور گلاب

یہ تو تھا تنہائی کا ماجرہ مگر موت کے موضوع پر لکھے گئے فیض صاحب کے اشعار کی نوعیت ذرا مختلف ہے۔ اس شاعری میں ان کا تفکر اور ان کا پیغام نمایاں طور پر شامل نظر آتا ہے۔ مثلاً شہادت کی موت کو جس شاندار اور پرزور الفاظ میں بیان کیا گیا اس کے لیے کسی دلیل کی ضرورت نہیں ہے۔ جب وہ کہتے ہیں:

لو وصل کی ساعت آ پہنچی، پھر حکم حضوری پر ہم نے
آنکھوں کے دریچے بند کئے اور سینے کا درباز کیا

بلکہ میرے نزدیک تو یہ شعر بھی اسی زمرے میں آتا ہے

جس دھج سے کوئی مقتل کو چلا وہ شان سلامت رہتی ہے
یہ جان تو آنی جانی ہے اس کی تو کوئی بات نہیں

تنہائی ساری زندگی فیض صاحب کا تعاقب کرتی رہی کبھی جیل خانوں کے ٹھنڈے فرش پر زندان کی سلاخوں کے پیچھے۔ کبھی غریب الوطنی میں اجنبی شہر کی انجان گزرگاہوں میں۔ انہوں نے زندگی میں تنہائی کے بہت سے روپ اور بہت سے رنگ دیکھے۔ ان رنگوں اور ان تصویروں کے سب پہلو ان کی شاعری میں منعکس ہوتے رہے۔ وہ تنہائی سے گھبراتے رہے مگر تنہائی کے بارے میں برابر لکھتے رہے۔ ان کی بڑھتی ہوئی عمر کے ساتھ ساتھ ان کی شاعری تنہائی روپ دیکھاتی رہی اور وہ اس کے ہر روپ اور ہر رنگ کو عکس بند کرتے رہے۔ انہوں نے تنہائی کو محسوس بھی کیا، دیکھا بھی اور برتا بھی۔ اور اب یہ سب ان کی شاعری کا ایک بہت بڑا سرمایہ معلوم ہوتا ہے۔ ذرا غور سے ان اشعار پر غور کریں اور دیکھیے۔ یہ تنہائی کا کون سا رنگ ہے۔

درد آئے گا دبے پاؤں

اور کچھ دیر میں، جب پھر مرے تنہا دل کو
فکر آئے گی کی تنہائی کا کیا چارہ کرے
درد آئے گا دبے پاؤں لیے سراغ چراغ

وہ جو اک درد دھڑکتا ہے کہیں دل سے پرے
دل سے پھر ہوگی مری بات اے دل اے دل
یہ جو محبوب بنا ہے تری تنہائی کا
یہ تو مہماں ہے گھڑی بھر کا، چلاجائے گا
اس سے کب تیری مصیبت کا مداوا ہوگا
مشتعل ہوکے ابھی اٹھیں گے وحشی سائے
یہ چلا جائے گا، رہ جائیں گے باقی سائے
رات بھر جن سے ترا خون خرانہ ہوگا

کچھ اسے سے ملتی جلتی کیفیت کی ایک اور نظم بھی ہے جس کا عنوان ہے ''کہاں جاؤ گے''۔ یہ بات قابل توجہ ہے کہ دونوں نظموں کے درمیان چھ سات برس کا فاصلہ ہے۔ پہلی نظم انہوں نے 1954 میں لکھی جب وہ منٹگمری جیل میں تھے اور دوسری 1961 میں جب وہ لندن میں غریب الوطنی کی زندگی گزار رہے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ اگرچہ ان کے اہل خانہ ان کے ساتھ تھے۔ مگر وہ صبح شام اپنے وطن، اپنے شہر اور اپنے دوستوں کو یاد کرتے تھے۔ ان کا دل اُچاٹ تھا۔ ہر دو نظموں کو پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ قید کی زندگی اور جلاوطنی کی زندگی میں کچھ زیادہ فرق نہیں ہوتا۔ تنہائی کی صورت مختلف ہوتے ہوئے بھی ایک ہی سی ہے۔

کہاں جاؤ گے

اور کچھ دیر میں لٹ جائے گا ہر بام پہ چاند
عکس کھو جائیں گے آئینے ترس جائیں گے
عرش کے دیدہ نمناک سے باری باری
سے ستارے سر خاشاک برس جائیں گے
آس کے مارے تھکے ہارے شبستانوں میں
بے وفائی کی گھڑی ترک مدارات کا وقت
اس گھڑی اپنے سوا یاد نہ آئے گا کوئی
ترک دینا کا سماں ختم ختم ملاقات کا وقت
اس گھڑی ایے دل آوارہ کہاں جاؤ گے
اس گھڑی کوئی کسی کا بھی نہیں رہنے دو
کوئی اس وقت ملے گا ہی نہیں رہنے دو

موت کے بارے میں بھی فیض احمد فیض صاحب کی نظموں کی تعداد کم وبیش اس قدر ہے جس قدر تنہائی کے موضوع پر لیکن موت کے ساتھ دل کا تعلق کچھ اور طرح کا تھا۔ ان کی نظموں میں ایک رومانس ہے موت سے ان کی چھیڑ خانی ساری زندگی جاری رہی۔ بالکل ابتدائی

دور کی شاعری میں بھی انہوں نے بار بار ایسے اشعار کہے جو بقاوفنا کے موضوع پر تھے۔

موت کیا ہے؟ اس کی کیسی صورت ہے؟ اس کی پہچان کیا ہے؟ اس کی ملاقات فانی انسان سے کیسے ہوگی؟ موت کے لیے فیض صاحب کے تصور میں بہت سی شکلیں ابھرتی تھیں، مگر ان میں کوئی صورت بھی ایسی نہیں جس میں بیگانگی، کراہت یا نفرت کا شائبہ تک ہو۔ ان کے نزدیک موت سے ملاپ کی تمام صورتیں نغمگی، خوشبو اور موسقیت سے عبارت ہیں۔ مرنے سے برسوں پہلے انہوں نے ایک نظم لکھی تھی:

کس روز قضا آئے گی

کس طرح آئیگی جس روز قضا آئیگی
شاید اس طرح کہ جس طور کوئی اول شب
بے طلب پہلے پہل مرحمت بوسۂ لب
جس سے کھلنے لگیں ہر سمت طلسمات کے در
اور کہیں دور سے انجان گلابوں کی بہار
یک بیک سینۂ مہتاب کو تڑپانے لگے
شاید اس طرح کہ جس طور کبھی آخر شب
نیم وا کلیوں سے سر سبز سحر
یک بیک ہجرہ محبوب میں لہرانے لگے
اور خاموش دریچوں سے بہ ہنگام رحیل
جھلملاتے ہوئے تاروں کی صدا آنے لگے
کس طرح آئے گی جس روز قضا آئے گی
شاید اس طرح کی جس طور تہہ نوک سناں
کوئی رگ واہمہ درد سے چلانے لگے
اور قزاق سناں دست کا دھندلا سایہ
از کراں تابہ دہر پہ منڈلانے لگے
جس طرح آئیگی جس روز قضا آئیگی
خواہ قاتل کی طرح آئے محبوب صفت
دل سے بس ہوگی یہی حرف ودع کی صورت
اللہ الحمد بانجام دل دل زدگاں
کلمۂ شکر بنام لب شیریں رہنا

فیض صاحب زندگی سے بہت پیار کرتے تھے۔ انہیں جینا اچھا لگتا تھا۔ وہ زندگی کی نعمتوں سے لطف اٹھانا چاہتے تھے۔ وہ

تاحیات زندگی کے شکر گزار رہے۔ دنیا سے کوچ کا نقشہ بھی ان کے نزدیک کچھ ایسے تھا جیسے کوئی اپنے کسی بہت ہی عزیز آشنا یا محبوب سے ملاقات کو جا رہا ہو۔

یہ قطعہ فیض صاحب کے کسی کلام میں تو نہیں لیکن ڈاکٹر سلیم الزماں صدیقی کی بیاض میں انہوں نے خود اپنے ہاتھ سے لکھا ہے۔

ہم اپنے وقت میں گزرے جہان گزراں سے
نظر میں رات لیے دل میں آفتاب لیے
ہم اپنے وقت میں پہنچے مصور یزداں میں
لبوں پہ حمد لیے ہاتھ میں شراب لیے

یہ خیال ہے کہ ایسا بھی نہیں ہے کہ فیض صاحب موت کے درد سے ناواقف ہوں انہوں نے کئی بار موت کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔ ایک بار جب انہیں پہلی بار دل کا شدید دورہ پڑا۔ یہ 1967 کی بات ہے۔ ڈاکٹر ایوب مرزا کے بیان کے مطابق اس دور کی کیفیت ان کی اس نظم میں چھلکتی ہے۔

ہارٹ اٹیک

درد اتنا تھا کہ اس رات دل وحشی نے
ہر رگ جاں سے الجھنا چاہا
ہر بن مو سے ٹپکنا چاہا
اور کہیں درد ترے صحن میں گویا
پتا پتا مرے افسردہ لہو میں ڈھل کر
حسن مہتاب سے آزردہ نظر آنے لگا
میرے ویرانۂ تن میں گویا
سارے دکھتے ہوئے رشتوں کی طنابیں کھل کر
سلسلہ وار پتہ دینے لگیں
رخصت قافلہ شوق کی تیاری کا
اور جب یاد کی بجھتی ہوئی شمعوں میں
نظر آیا کہیں
ایک پل آخری لمحہ تیری دلداری کا
درد اتنا تھا کہ اس سے بھی گزرنا چاہا
ہم نے چاہا بھی مگر دل نہ ٹھہرنا چاہا

دوسری بار 1983 میں جلاوطنی سے واپسی پر سخت علیل ہوئے۔ ''فیض نامہ'' کے مصنف اور فیض صاحب کے ذاتی معالج ڈاکٹر

ایوب مرزا نے لکھا ہے:

''فیض صاحب لاہور میں تھے۔ مجھے اطلاع ملی تو میں ایک ثانیہ ضائع کیے بغیر اسلام آباد سے لاہور کے میو ہسپتال میں جا پہنچا۔ حالت یہ تھی کہ ان کا سانس اکھڑ چکا تھا۔ آکسیجن ماسک منہ پر تھی، بازو میں ڈرپ لگی تھی۔ نبض ڈوب رہی تھی۔ میں نے آہستہ سے ان کا دایاں ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر دبایا۔ انہوں نے صرف آنکھیں گھما کر دیکھنے کی کوشش کی۔

یونہی ہی چھ روز گزر گئے۔ ساتویں صبح میں نے دروازہ کھولا۔ کیا دیکھتا ہوں۔ فیض صاحب کلین شیو، ہاتھ منہ دھوئے دھلائے بستر پر بیٹھے ہیں۔ میں نے بڑھ کر پیشانی پر بوسہ دیا اور پوچھا ''اجازت ہے''، بولے ہاں بھئی تم جا سکتے ہو اور یہ تازہ نظم ہے:

اس وقت تو یوں لگتا ہے

اس وقت تو یوں لگتا ہے اب کچھ بھی نہیں ہے
مہتاب نہ سورج، نہ اندھیرا نہ سویرا
آنکھوں کے دریچوں پہ کسی حسن کی چلمن
اور دل کی پناہوں میں کسی درد کا ڈیرا
ممکن ہے کوئی وہم تھا، ممکن ہے سنا ہو
گلیوں میں کسی چاپ کا اک آخری پھیرا
شاخوں میں خیالوں کے گھنے پیڑ کی شاید
اب آکے کرے گا نہ کوئی خواب بسیرا
اک بیر، نہ اک مہر، نہ اک ربط نہ رشتہ
تیرا کوئی اپنا، نہ پرایا کوئی میرا
مانا کہ یہ سنسان گھڑی سخت کڑی ہے
لیکن مرے دل یہ تو فقط اک ہی گھڑی ہے
ہمت کرو، جینے کو تو اک عمر پڑی ہے

یوں موت اور تنہائی کی دھوپ چھاؤں سے گزرتا ہوا۔ ہمارا شاعر آہستہ آہستہ اس مقام تک پہنچ گیا جب یہ دونوں ایک ہو جاتے ہیں اور یہ تمیز نہیں رہتی کہ کہاں تنہائی کی سرحدیں ختم ہوتی ہیں اور موت کی علمداری شروع ہو جاتی ہے۔ فیض صاحب کو خود اس بات کا بخوبی احساس تھا۔

یہ کس دیارِ عدم میں۔۔۔۔۔۔۔۔

نہیں ہے یوں تو نہیں ہے کہ اب نہیں باقی
جہاں میں بزم گہہ حسن عشق کا میلا
بنائے لطف، رواج، مہر و وفا

یہ کس دیار عدم مقیم ہیں ہم تم
جہاں پہ مژدہ دیدار حسن یار تو کیا
توید آمد روز جزا نہیں آتی
یہ کس خمار کدے میں ندیم ہیں ہم تم
جہاں پہ شورش زندان میگسار تو کیا
شکست شیشہ دل کی صدا نہیں آتی

فیض صاحب رخصت ہوگئے۔ایک بڑا شاعر ہم سے جدا ہوگیا۔ایک بڑا انسان مر گیا۔لیکن انہوں نے خود جیسی زندگی گزاری اپنے ماتم گساروں کے لیے اس طرح کا پیغام چھوڑ گئے۔

میرے خیال میں کسی بھی ذی نقش کی موت ہر تعزیت کے لیے اس سے بہتر الفاظ ممکن نہیں

شورش بربط و نے

ہستی کی متاع ہے باپاں جاگیر تری ہے نہ مری ہے
اس بزم میں اپنی مشعل جاں بسمل ہے تو کیا رخشاں ہے تو کیا
یہ بزم چراغاں رہتی ہے اک طاق اگو ویراں ہے تو کیا
افسردہ ہیں گر ایام ترے، بدلہ نہیں مسلک شام و سحر
ٹھہرے نہیں موسم گل کے قدم، قایم ہے جمال شمس و قمر
آباد ہے وادی کا کل ولب ،شاداب و حسین گلگشت نظر
مقسوم ہے لذت در د جگر، موجود ہے نعمت دیدہ تر
اس دیدہ تر کا شکر کرو اس ذوق نظر کا شکر کرو
اس شام سحر کا شکر کرو، ان شمس و قمر کا شکر کرو